بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اعلان کیا گیا تھا کہ رجب کی اشاعت اس رسالہ کی اشاعت خاص ہوگی جس میں وہ تمام سیاسی مضامین یکجا درج کیے جائیں گے جو شعبان ۱۳۵۶ھ سے ابتک لکھے جاچکے ہیں۔ لیکن اوّل تو ان مضامین کی تدوین جدید کے سلسلہ میں نئے مباحث اس قدر کثرت سے پیدا ہوگئے کہ ان کو سمیٹنا مشکل ہوگیا، اور خوف ہوا کہ پرچہ کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوجائے گی۔ دوسرے اسی زمانہ میں ادارہ دارالاسلام کی تاسیس عمل میں آگئی جس کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ ناظرین ترجمان القرآن کو بلا تاخیر اس کی اطلاع دی جائے اور اس ادارہ کی اسکیم اور دستور العمل کو بھی ان تک پہنچا دیا جائے۔ لہٰذا اشاعت خاص کو ملتوی کرکے یہ پرچہ شایع کیا جارہا ہے۔ انشاء اللہ شعبان کی اشاعت اس مجموعۂ مضامین پر مشتمل ہوگی جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔

دارالاسلام کی تحریک جن مقاصد کے لئے شروع کی گئی ہے ان کی توضیح وقتاً فوقتاً ان صفحات میں کی جاتی رہی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تحریک ابتک لوگوں کے لئے ایک معمّا ہے۔ ہر انقلابی تصور ابتدا میں معمّا ہی ہوا کرتا ہے اور انقلابی تصوّرات کی فطرت ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے۔ مخالفین ہی نہیں بلکہ اس تحریک سے ہمدردی اور دلچسپی رکھنے والوں کے دل میں بھی اس کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے رہے ہیں اور ان کا جواب مانگنے کے لئے روز بروز زیادہ بےچینی کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ پوچھا جاتا ہے کہ "دارالاسلام" سے آخر تمھاری کیا

مراد ہے؟ کیا غیر مسلم حکومت کے اندر کوئی دارالاسلام بن سکتا ہے؟ جہاں انگریزی فوج اور پولیس موجود ہے، انگریزی عدالتیں قائم ہیں، انگریزوں کا قانون چل رہا ہے اور انگریزی دستور پر حکومت کا نظم ونسق قائم ہے کیا وہاں کوئی ایسی چیز موجود ہوسکتی ہے جسے دارالاسلام کہا جاسکے؟ اور اگر یہ نہیں تو کیا تمہارا مقصد اسلامی حکومت قائم کرنا ہے؟ لیکن یہ ہو کس طرح سکتا ہے؟ اوپر انگریزی حکومت پوری قاہرانہ طاقت سے مسلط ہے۔ اس کے نیچے غیر مسلم اکثریت ہے۔ اور ان دونوں کے نیچے تم ہو منتشر۔ بے بس خستہ حال اور پراگندہ بال۔ اس حالت میں تم کس طرح اسلامی حکومت قائم کردو گے؟ عقل وہوش کھو چکے ہو تو بات دوسری ہے۔ ورنہ ہمیں سمجھاؤ کہ ایسا عظیم انقلاب آخر رونما کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر یہ محض آرزو اور تمنا کا اظہار ہے تو اس کے خوش آئند ہونے میں کلام نہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم بھی اس تمنا میں تمہارے ساتھ ہیں۔ مگر خوابوں کی دنیا سے نکل کر آؤ عملی دنیا میں آکر ہمیں بتاؤ کہ یہ کیونکر ممکن ہے؟ اور ممکن کا کیا ذکر، اس نام کو تو اس حالت میں زبان پر لانا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ تم کہتے ہو ہم اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہندو کہیں گے ہم کو رام راج مطلوب ہے۔ سکھ اپنی حکومت چاہیں گے۔ اور ہر دوسری قوم یہی داعیہ لے کر اٹھے گی کہ حکومت ہماری ہو۔ درآنحالیکہ انگریز سب کے سر پر مشین گن لیے کھڑا ہے۔ اب ہندوستان کی مختلف قوموں کا اپنی اپنی قومی حکومتوں کے لیے الگ الگ جدوجہد کرنا اس کے سوا اور کیا نتیجہ دکھا سکتا ہے کہ یہ سب آپس میں دست بگریباں ہوں اور انگریز اطمینان کے ساتھ حکومت کرتا رہے۔

یہ شبہات اور اعتراضات ہیں جو ہمارے پڑھے لکھے، اسلامی جذبات رکھنے والے، اور اسلام کی ترقی و سربلندی کے لئے مخلصانہ بے چینی رکھنے والے افراد میں سے قریب قریب ۹۹ فی صدی لوگوں کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔

ایک دوسری جماعت کچھ اس سے بھی زیادہ قوی شبہات رکھتی ہے۔ اس کو اسی میں شبہ ہے کہ اس زمانہ میں کوئی اسلامی حکومت ـــــ مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ قانون اسلام کی حکومت ـــــ چل بھی سکتی

ہے یا نہیں۔ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کا قانون، جو صحرائے عرب کے غیر متمدن بدووں میں پیدا ہوا، جو صدیوں پہلے کی سوسائٹی کے لئے وضع کیا گیا تھا، جس میں ہاتھ کاٹنے اور کوڑے لگانے اور سنگسار کرنے کی سزائیں ہیں، جس میں نوسو برس سے نشو و ارتقار کا دروازہ بند ہے، آج اس دورِ تمدن میں کسی ترقی پذیر سوسائٹی اور عہدِ جدید کی ریاست (Modern State) کے لئے کیسے موزوں ہو سکتا ہے؟ مالیات کے پیچیدہ مسائل جو آج پیدا ہو رہے ہیں انہیں وہ کیسے حل کرے گا؟ صنعتی انقلاب نے جو پیچیدہ تر معاشی اور اجتماعی مسائل پیدا کر دیے ہیں جنھیں حل کرنا اس زمانہ کے بڑے بڑے حکیموں اور مدبروں کے لئے مشکل ہو رہا ہے، ان کا حل وہ کہاں سے لائے گا؟ دورِ حاضر کی حکومت کے لئے دستور اور بین الاقوامی تعلقات کے لئے ضابطہ جو بہر حال درکار ہے، اس میں کہاں ملے گا؟ —— یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوالات ہیں جو آج غیر مسلموں ہی کے دلوں میں نہیں، خود مسلمانوں کے دلوں میں بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ کوئی انہیں برملا زبان پر لاتا ہے اور کوئی ان کو دل ہی دل میں اپنی عقیدت مندی کے نیچے دبائے رکھتا ہے۔

جذباتی رنگ میں ان سب کو جواب دیدینا بہت آسان ہے۔ ایک گروہ سے کہہ دیجئے کہ تم پست ہمت ہو۔ مسلمان ہو کر ایسی کمزوری کی باتیں کرتے ہو! اٹھو اور اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ کا نقشہ جما دو۔ دوسرے گروہ کو ڈانٹ بتائیے کہ تم بدعقیدہ ہو، جاہل ہو، اگر تمھیں اسلام کے ایک مکمل ضابطۂ زندگی اور دائمی قانون ہونے میں شک ہے تو اپنے آپ کو مسلمان کیوں کہتے ہو —— ایسے جوابات سے سب کا نہیں تو کچھ لوگوں کا منہ ضرور بند کیا جا سکتا ہے، اور خطابت کا سکہ بھی جمایا جا سکتا ہے، مگر جب دار الاسلام کا نام لینے سے محض گرمیِ محفل اور سستی شہرت مطلوب نہ ہو بلکہ فی الواقع سنجیدگی کے ساتھ اسے نصب العین بنایا گیا ہو اور اس کو حاصل کرنا حقیقت میں مطلوب ہو تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ دونوں قسم کے شبہات کو اطمینان بخش طریقہ سے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایک گروہ کو بتایا جائے کہ یہ چیز جو بظاہر غیر ممکن نظر آتی ہے، اس طرح ممکن ہے، اور اس تک پہنچنے کا صحیح راستہ یہ ہے۔ اور

دوسرے گروہ کو بتایا جائے کہ اسلام نہ صرف ماڈرن بلکہ الٹرا ماڈرن اسٹیٹ کو چلانے کے لئے بھی ایک بہتر دستور اور ضابطہ رکھتا ہے جو ایک ایک جز میں موجودہ زمانہ کے جمہوری اور فاشستی اور سوویٹ دستوروں سے فائق تر ہے۔ موجودہ زندگی کا ایک ایک مسئلہ جس کو تم پیچیدہ سمجھتے ہو، اس کو اسلام نے زیادہ سائنٹفک اور زیادہ صالح طریقے سے حل کیا ہے۔

یہ طرز جواب اختیار کرنا ہمارے لئے ناگزیر ہے اگر ہم اپنے نصب العین کی طرف مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ وسیع تر انسانیت کے معقولیت پسند اور کارکن اور کارفرما عنصر کو کھینچنا چاہتے ہیں۔ سراسر جذباتی لوگ بھی اگرچہ ایک حیثیت سے مفید ہوتے ہیں اور ایک موقع پر ان کی ضرورت ہوتی ہے لیکن محض ان کے ہاتھوں سے کوئی حقیقی اور پائدار انقلاب برپا ہو جانا ممکن نہیں۔ ان کے ساتھ تعمیری قابلیتیں رکھنے والوں کا اشتراکِ عمل ضروری ہے اور وہ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل کے ساتھ دماغ سے بھی اپیل نہ کیا جائے۔

ہمارے متعلق لوگوں کے خیالات خواہ کچھ ہوں ـــــ اور کون ہے جس کے متعلق مختلف خیالات لوگوں میں پائے نہیں جاتے ـــــ مگر اپنی جگہ ہم اپنے مقصد میں بالکل سنجیدہ ہیں اور اسے حاصل کرنے کا قطعی ارادہ رکھتے ہیں، اس لئے ہم ان شبہات اور سوالات کو خطابت سے دبانا نہیں چاہتے بلکہ معقولیت سے جواب دینا چاہتے ہیں تاکہ ہماری قوت میں اضافہ ہو۔

ادارۂ دارالاسلام کے دستور العمل سے پہلے توضیح مقاصد و طریق کار کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مدعا یہی ہے۔ اس میں ہم نے پہلے گروہ کے تقریباً ہر سوال کا جواب دیا ہے، اور دوسرے گروہ کے سوالات کا جواب دینے کے لئے جس تیاری کی ضرورت اس کا خاکہ پیش کر دیا ہے۔ پہلا گروہ ہم سے قریب تر ہے۔ سب سے پہلے ہم اس کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مطمئن ہو تو ہمیں اپنے علمی اور عملی شعبوں کے لئے رنگروٹ ملیں۔ اور یہ فوج مرتب ہو تب کہیں ہم دوسرے گروہ کو فتح کرنے کے لئے آگے بڑھ سکیں گے۔

پہلے گروہ کے سوالات کا جو جواب ہم نے دیا ہے اگرچہ وہ ہمارے لئے واضح ہے، مگر ہم کو خود احساس ہے کہ وہ دوسروں کے لئے، اور خصوصاً شبہات رکھنے والوں کے لئے اتنا واضح نہیں ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں جن کو سمجھنے میں وہ اب بھی الجھیں گے۔ مثلاً ہماری دفاعی پالیسی میں ان کو اس قسم کے سوالات پریشان کریں گے کہ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی جماعتوں کے رویہ میں تم کیا نقائص پاتے ہو اور اس میں کس نوعیت کا تغیر چاہتے ہو؟ بین الاقوامی وفاق، مساویانہ حصہ داری اور کلچرل آٹانومی، جن کے مجموعہ کو تم شبہ دارالاسلام سے تعبیر کرتے ہو اس کی تفصیلی صورت کیا ہے؟ آخر وہ کونسے انقلابی ذرائع ہیں جو اس ابتدائی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کارگر، ممکن العمل اور ضروری ہیں؟ پھر اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد تم آخری مرحلے کی طرف کس راستہ سے بڑھو گے؟ یہ سوالات قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں اور تفصیلی بحث چاہتے ہیں۔

ان شاء اللہ الکریم ترجمان کی آئندہ اشاعتوں میں ہم خود ان سوالات کو چھیڑ کر ایک ایک کی توضیح و تشریح کریں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم ان سب لوگوں سے جو ہمارے دستور العمل کے مقدمہ کا مطالعہ کریں، درخواست کرتے ہیں کہ اس پر زیادہ سے زیادہ گہری تنقیدی نگاہ ڈالیں، اور جس قدر اعتراضات ان کے ذہن میں پیدا ہوں اُن سے ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ ہر ممکن پہلو سے ان مسائل پر روشنی ڈالی جا سکے۔

دوسرے گروہ کا معاملہ اگرچہ نسبتاً موخر ہے، مگر اس سے بھی ہم غافل نہیں ہیں۔ ادارہ دارالاسلام کی تاسیس عمل میں آتے ہی اوّلین کام جو کیا گیا وہ علمی شعبہ کا قیام تھا۔ سردست اس میں صرف دو آدمی ہیں۔ ایک مولوی صدرالدین اصلاحی۔ دوسرا ابوالاعلیٰ مودودی۔ اگرچہ بے سروسامانی قابل داد ہے۔ اتنا عظیم الشان کام سامنے ہے اور صرف دو آدمی اس کی ابتدا کر رہے ہیں، اور وہ بھی اس حال میں کہ کتب خانہ گویا موجود ہی نہیں۔ لیکن اگر ہمارا عزم راسخ اور ہماری نیت خالص ہے تو یہی بے سروسامانی

جس پر شاید بعض لوگ مضحکہ اڑانے میں بھی تامل نہ کریں گے، ایک روز رحمتِ الٰہی کی مستحق ثابت ہوگی ۔۔۔ اس شعبہ کے لئے ہم کو ایک اعلیٰ درجہ کا منتخب کتب خانہ درکار ہے، اور نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت مطلوب ہے جو بہترین ذہنی صلاحیتیں رکھنے کے ساتھ اونچے ارادے اور ان ارادوں میں اپنے آپ کو فنا کردینے کی قوت رکھتے ہوں خصوصیت کے ساتھ ہماری آنکھیں علی گڈھ، دیوبند، جامعہ ملیہ، ندوہ، مدرسۃ الاصلاح، اور جامعہ دارالسلام کے نونہالوں کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

اس کے ساتھ شعبۂ اشاعت بھی قائم کردیا گیا ہے جس سے "مسلمانانِ ہند اور موجودہ سیاسی کشمکش" کا حصّہ دوم عنقریب شائع ہوگا، اور اس کے بعد اُن مضامین کے مجموعوں کی اشاعت شروع کردی جائے گی جو گذشتہ پانچ چھ سال کی مدت میں بہت سے فقہی، تمدنی، معاشی اور اعتقادی مسائل پر ترجمان القرآن میں شائع ہوچکے ہیں، مثلاً "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی"، "حقوق الزوجین"، "مسئلہ سود"، "مسئلہ حجاب"، "قومیتِ اسلام" وغیرہ۔ جن حضرات نے ان مضامین کی اشاعت کے لئے حیدرآباد میں مجھے روپیہ بھیجا تھا ان کی تمام رقمیں ادارہ کے بیت المال میں داخل کردی گئی ہیں اور یہیں سے ان کو باقاعدہ حساب بھیجا جائے گا۔

یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ اس موقع پر ہمارے لئے کم از کم ایک ہفتہ وار اخبار کی سخت ضرورت ہے۔ محض ایک ماہوار رسالہ ان مقاصد کے لئے بالکل ناکافی ہے جو ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ جب تک ہمارا ایک پرچہ تیار ہوکر نکلتا ہے دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ ہمارا اور حریف طاقتوں کا مقابلہ گویا چھکڑے اور موٹر کا مقابلہ ہے۔ روزانہ بیسیوں مسائل پیش آتے ہیں جن پر وقت کے وقت لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، مگر ہمیں مجبوراً دوسرے مہینہ کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور ماہوار رسالہ کی اشاعت کا وقت آتے آتے وہ مسائل پرانے ہوکر رہ جاتے ہیں۔ علاوہ بریں اس رسالہ کی حیثیت بھی اس کی متقاضی ہے کہ اس کو صرف اصولی مباحث کے لئے مخصوص رکھا جائے اور اگر فروعی مسائل چھیڑے بھی جائیں تو صرف اس حد تک کہ ان سے اصول کی تشریح ہوسکے۔ اس سے زیادہ تفصیلی و جزئی

مسائل کا یہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اس کے لئے ایک اخبار ہی کی ضرورت ہے۔

ابھی حال میں ایک عالم دین نے اُس مخصوص جرأت کے ساتھ جو اس دورِ حرّیت کے صلحاء و اتقیاء ہی کو میسر آسکتی ہے، اپنے اخبار کے ذریعہ سے دنیا کو اطلاع دی ہے کہ ادارہ دارالاسلام کو پچاس ہزار روپیہ ملا ہے۔ کاش یہی خبر سچی ہو گئی ہوتی!۔

دستور العمل کے باب میں بھی چند شبہات پیدا ہو سکتے ہیں جنھیں اس موقع پر صاف کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوست نے لکھا اور بعض حضرات نے مجلس مشاورت میں بھی اس خیال کا اظہار کیا کہ اس دستور العمل میں بہت زیادہ قوانین وضوابط بنائے گئے ہیں، اور تفصیلات وجزئیات کے استقصا میں غلو برتا گیا ہے حالانکہ ضوابط کو عملی زندگی اور تجربہ کی ترقی کے ساتھ فطری طور پر نشوونما پانے اور جڑ پکڑنے کے لئے چھوڑ دینا چاہئے ــــــ یہ اعتراض کافی وزن رکھتا ہے۔ میں خود بھی دستور العمل کی تسوید کے وقت اس پہلو سے خالی الذہن نہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ ایک دوسرا پہلو بھی میرے سامنے تھا جس نے مجھے اتنی تفصیلات بیان کرنے پر آمادہ کیا اور وہ اس سے زیادہ وزن رکھتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہم ایک ایسا انقلابی تصور لے کر اُٹھے ہیں جو تمدن واجتماع کے موجودہ نظم و ترتیب اور اجتماعی زندگی کے رائج الوقت طریقہائے عمل کو قریب قریب الٹ دینا چاہتا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی فطرت اور اپنے مزاج کے مطابق ایک نئی ذہنیت، نئی ترتیب، نیا نظام، اور نیا طرزِ عمل مانگتا ہے۔ جن لوگوں کے پیشِ نظر صرف یہ چیز ہے کہ مسلمان ــــــ جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان کہلاتے ہیں اور مردم شماری میں مسلمان لکھے جاتے ہیں ــــــ ان کا قومی تشخص برقرار رہے اور ایک مستقل قوم ہونے کی حیثیت سے وہ ترقی اور سربلندی حاصل کریں، ان کی انقلاب پسندی کا تقاضا تو اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ جہاں غیر مسلم کو تمکن حاصل ہے وہاں مسلمان متمکن ہو جائے، قطع نظر اس سے کہ اس کی ذہنیت کا سانچہ اور

اس کی زندگی کا نظام کوئی بھی ہو۔ ان کے پیش نظر نظام ہے ہی نہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کی تقلید بھی کر سکتی ہیں، اشتراکی سوفیات (Soviets) کی نقل بھی اتار سکتے ہیں، اور ہٹلریت و مسولنیت کو بھی اسٹو بنا سکتی ہیں لیکن ہماری انقلاب پسندی محض مادی انقلاب نہیں چاہتی بلکہ اخلاقی اور نظمی انقلاب چاہتی ہے۔ ہم موجودہ غیر اسلامی نظام کو الٹ کر ایک نئی اجتماعی زندگی کی تعمیر چاہتے ہیں جس کی بنا اسلامی ذہنیت اور اسلامی اصولوں پر ہو۔ اس لئے موجودہ زمانہ کے جمہوری ادارات یا فاشستی نظامات کا ڈھنگ اختیار کرنا ہمارے لئے مشکل بلکہ محال ہے۔

اب ایک بڑی دشواری یہ پیش آتی ہے کہ اسلامی طرز ادارہ مدتہائے دراز سے معطل ہے۔ صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ عموماً مسلمانوں کی طبائع بھی اس سے مانوس نہیں رہی ہیں۔ موجودہ زمانہ کے ادارات کا طریق کار کچھ اس طرح فضا پر چھایا ہوا ہے کہ اچھی خاصی اسلامی ذہنیت کے مسلمان بھی مشکل اس امر کا تصور کر سکتے ہیں کہ اسلامی جمہوریت کس طرز پر کام کرتی ہے۔ اس کے بنیادی اصولوں کا ایک دھندلا سا خاکہ تو ان کے ذہن میں آسکتا ہے، مگر عملی تفصیلات میں کہیں فاشستی آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کے طور طریقے ان کے سامنے آجاتے ہیں، اور کہیں جمہوری ادارات کے طریق کارروائی کی طرف بلا ارادہ ان کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ اگر دستور العمل میں محض اتنا لکھ دیا جائے کہ "یہ ادارہ اسلامی جمہوریت کے طرز پر کام کرے گا" تو روزمرہ کے کاروبار میں ارکان کے لئے اس کی تعبیر و تفسیر کرنا مشکل ہو جائے گا، اور آئے دن جزئی معاملات میں کارکنوں کی پراگندگی فکر و عمل سے اتنی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی کہ ان کے حل کرنے ہی میں صدر ادارہ کا سارا وقت کھپ جائے گا۔ اسی خرابی کو دور کرنے کے ضروری سمجھا گیا کہ دستور العمل میں اسلام کے جمہوری طرز ادارہ کی تفصیلی صورت پیش کر دی جائے۔ یہ مصلحت اس وقت اور زیادہ واضح ہو گئی جب ہماری مجلس مشاورت میں دستور العمل کے مسودہ پر کامل تین روز تک مباحث کا سلسلہ جاری رہا۔ ان مباحث سے اندازہ ہوا کہ اسلامی جمہوریت کے طریق کارروائی کو سمجھنا ہمارے موجودہ ماحول میں لوگوں کے لئے کس قدر مشکل ہے اور اس کے جزئیات ہی نہیں، اصول

اور کلیات تک کے متعلق کتنے غلط تصورات دماغوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

دستور العمل کا تفصیلی مطالعہ کرتے وقت بعض چیزوں کو دیکھ کر لوگوں کو شبہ ہوگا کہ یہ زمانہ حال کے جمہوری ادارات کی نقل ہے، اور بعض دوسری چیزوں کو دیکھ کر وہ گمان کریں گے کہ شائد یہاں ڈکٹیٹر شپ کو اسوہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسلامی جمہوریت کے اصولوں کی بھی تھوڑی سی تشریح کردی جائے۔ اگرچہ یہ موضوع ایک اشارہ نہیں بلکہ ایک کتاب مانگتا ہے، مگر العاقل تکفیہ الاشارہ۔

علم السیاست کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) کس کی ہے۔ اس کے حل کی مختلف صورتیں انسان نے اختیار کی ہیں۔ ایک صورت بادشاہی کی ہے جس میں حاکمیت سمٹ کر ایک شخص کی ذات میں مرتکز ہو جاتی ہے۔ دوسری شکل جمہوریت کی ہے جس کی اساس عمومی حاکمیت (Popular Sovereignty) پر رکھی گئی ہے۔ پہلی صورت میں جو فساد تھا اسے دور کرنے کے لئے دوسری صورت اختیار کی گئی مگر یہ بھی فساد سے لبریز نکلی۔ ظاہر ہے کہ عامۃ الناس کی حاکمیت عملاً قائم نہیں ہو سکتی۔ عملی اغراض کے لئے بہر حال اس کو کہیں نہ کہیں مرکوز کرنا پڑے گا اور جہاں بھی وہ مرکوز ہوگی وہیں سے فساد رونما ہوگا عام اس سے کہ وہ سرمایہ دار طبقہ میں مرکوز ہو، یا عمال کے طبقہ میں، یا ایک منظم پارٹی میں، یا کسی مقبول عام ڈکٹیٹر میں۔ اس فساد کے اسباب کی بہت کچھ چھان بین کی گئی ہے لیکن اصلی سبب تک لوگوں کی نظر نہیں پہنچی۔ اس کا اصلی سبب حاکمیت کا غیر محدود ہونا ہے۔ حاکمیت مطلقہ (Unlimited Sovereignty) خواہ عوام کی ہو یا ایک خاص طبقہ کی یا ایک شخص کی، ہر صورت تمام خرابیوں کی جڑ یہی ہے۔ ایک ایسی حد کا ہونا ہر حال میں ضروری ہے جو انسان کے اختیارات کو حدِ اعتدال میں رکھے، اور یہی حد انسانی کوششیں آج تک فراہم نہیں کرسکیں۔ اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے

کہ اس نے وہ چیز فراہم کر دی ہے جو انسانی اختیار کی صحیح حد بندی کر دیتی ہے یعنی **حدود اللہ**۔ ان حدود میں کسی کی حاکمیت نہیں، نہ کسی شخص کی نہ پوری جماعت کی۔ کوئی قانون ان کے خلاف وضع نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی حاکم ان کے خلاف حکم نہیں دے سکتا۔ کوئی ان کو توڑنے کے بعد اطاعت کا مستحق نہیں رہتا۔ یہ ایسا کانسٹی ٹیوشن ہے جس میں کوئی ترمیم ممکن نہیں۔

ان حدود کی نگہداشت پر اجتماعی معاملات کی درستی کا تمام تر انحصار ہے، کیونکہ یہ انسانی آزادی کا میگنا کارٹا، انسان کے بنیادی حقوق کا اعلان، اور انسانی تعلقات کی بہی ٹھیک ترتیب (Setting) ہے جس میں ذرا سا فرق آ جانے سے فساد کو گھس آنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ اس نظم کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف تو جماعت میں اتنا علم اور تقویٰ اور مضبوط کیرکٹر موجود ہو کہ وہ ان حدود کو سمجھے اور ان کو توڑنے سے ڈرے اور سختی کے ساتھ ان کی حفاظت کرے۔ اور دوسری طرف اس میں وہ طاقت موجود ہو جس سے وہ ان کی حفاظت کر سکے۔ پہلی چیز تعلیم و تربیت کے اس نظام سے پیدا ہوتی ہے جسے اسلام نے تجویز کیا ہے۔ اور دوسری چیز اسلام کا نظام جمہوریت ہے جس میں حدود اللہ کو مستثنیٰ کر کے تمام مسلمانوں کو بلا امتیاز طبقہ و گروہ، عام حاکمیت دی گئی ہے۔ ہر مسلمان اس حاکمیت میں یکساں حصہ دار ہے۔ ہر مسلمان اس دولت مشترکہ کا یکساں مالک ہے۔ ہر مسلمان کا مفاد اس میں دوسرے مسلمان کے برابر ہے۔ ہر مسلمان کو حق رائے دہی حاصل ہے۔ ایک کروڑپتی کے ووٹ اور ایک فقیر کے ووٹ میں اصلاً کوئی فرق نہیں، البتہ اگر فقیر زیادہ علم اور تقویٰ رکھتا ہے تو کروڑپتی کے ووٹ سے اس کا ووٹ زیادہ وزنی ہے۔ حق اور صواب کا مدار کثرت و قلت پر نہیں ہے۔ نہ کوئی چیز اس بنا پر صواب ہے کہ اس کے حق میں ہزار ہاتھ اٹھتے ہیں اور نہ کوئی اس لئے خطا ہے کہ اس کے حق میں ایک ہاتھ اٹھتا ہے۔

اس جمہوریت کو چلانے کے لئے جو نظام تجویز کیا گیا ہے وہ مغرب کے جمہوری دستوروں سے بالکل مختلف ہے،

اس لئے کہ اس کی فطرت ان سے مختلف ہے۔ وہاں حدود اللہ موجود نہیں ہیں، اور غیر محدود حاکمیت کو ایک جگہ مرکوز کر دینے سے تلخ تجربے ہوئے ہیں اس لئے ہر دستور کی تشکیل عدم اعتماد (Distrust) کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ واضعین دستور کی تمام تر کوشش یہ رہتی ہے کہ حاکمیت کہیں مرکوز نہ ہونے پائے اور ہر جگہ جہاں حاکمیت مجتمع ہو وہاں تحفظات (Safe-guards) اور موانع (Checks) بھی ہوں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مغرب میں جمہوریتیں ناکام ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ ملوکیت کی ایک دوسری شکل یعنی آمریت (Absolutism) لے رہی ہے جس کو محدود کرنے والی چیز رعایا کی بغاوت یا اندیشۂ بغاوت کے سوا کوئی نہیں ــــــ بالفاظ دیگر وہ ایک ایسا فساد ہے جسے ایک عظیم تر فساد کے سوا کوئی دوسری چیز دفع نہیں کر سکتی ــــــ اس کے برعکس اسلام میں حدود اللہ موجود ہیں، اور اجتماعی اخلاق کی بنا تقویٰ پر رکھی گئی ہے نہ کہ معاشی مفاد پر اس لئے یہاں دستور کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہے۔ یہاں عمومی حاکمیت کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے کہ قوم اپنے میں سے ایک شخص کو منتخب کرے جس کے علم، تقویٰ اور حسن تدبیر پر اس کو اعتماد ہو۔ اپنی حاکمیت کو بطور امانت اس کے سپرد کر دے جب تک وہ حدود اللہ کا پابند رہے سب اس کی اطاعت کریں۔ شوریٰ اس لئے ہو کہ اسے حق اور صواب تک پہنچنے میں مدد دی جائے نہ اس لئے کہ تحفظات اور موانع سے اس کو جکڑ بند کیا جائے۔ جب تک قوم کو اس پر اعتماد رہے، عمومی حاکمیت کی یہ امانت اس کے سپرد رہے، اور جب وہ حدود اللہ سے تجاوز کرے، یا اس امانت میں غلط تصرف کر کے قوم کا اعتماد کھو دے تو وہ اس سے واپس لے لی جائے۔ اس نظام میں تنقید کے عمومی حق اور امانت واپس لے لینے (Recall) کے اختیار کے سوا کسی تحفظ کی حاجت نہیں۔

ہم نے اپنے دستور میں اس طرز جمہوریت کو اختیار کیا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ یہ نظام صرف اسی وقت چل سکتا ہے جبکہ جمہور قوم میں حدود اللہ کا علم، ان کی نگہداشت کا مضبوط ارادہ اور تقویٰ کی روح موجود ہو۔ یہ کچھ اسلامی دستور پر ہی موقوف نہیں، دنیا کا کوئی دستور بھی قائم نہیں رہ سکتا اگر اس کی پشت پر رائے عام کی طاقت نہ ہو۔ ہر دستور اپنے حق میں رائے عام کی حمایت چاہتا ہے۔ انگلستان کا پارلیمنٹری نظام حکومت صرف اس وجہ سے چل رہا ہے کہ انگریزی قوم اس کو برقرار رکھنے

کا غیر متزلزل ارادہ رکھتی ہے اور کوئی شخص اپنے سر کو خطرے میں ڈالے بغیر اس کو توڑنے کا خیال بھی نہیں کرسکتا۔ اٹلی اور جرمنی کے دستوری نظام صرف اسی لئے ٹوٹ گئے کہ قوم میں ان کی حفاظت کا کوئی اجتماعی ارادہ موجود نہ تھا۔ بالکل اسی طرح اسلام کا جمہوری نظام بھی اپنی پشت پر صالحین و متقین کی جماعت چاہتا ہے جن میں اس نظام کی صحیح اسپرٹ اور اس کو برقرار رکھنے کی عزیمت موجود ہو۔ ابتدائی دور میں یہ نظام اسی لئے ٹوٹ گیا کہ نومسلموں کی بہت بڑی تعداد اسلامی جماعت میں داخل ہوگئی تھی جس کو اسلام کی اخلاقی تربیت کافی نہ ملی تھی اور اس انبوہ میں صالحین و متقین کا تناسب اس قدر کم رہ گیا تھا کہ قوم بحیثیت مجموعی خلافت راشدہ کے دستور کی حفاظت نہ کرسکتی تھی۔ اگر اسلامی جماعت میں توسیع (Expansion) اور استحکام (Consolidation) کا توازن قائم رہتا تو یہ صورت ہرگز پیش نہ آتی۔ اس سے بہت زیادہ، بدرجہا زیادہ کمزور اخلاقی حالت آج ہماری قوم کی ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ ایک صحیح اسلامی نظام جمہوریت کا سنبھالنا ایسی قوم کے لئے کس قدر مشکل ہے۔ اسی بنا پر ہم نے اپنے دستور العمل میں حلف رکنیت اور اخلاقی تربیت کو لازم کیا ہے، اور رکنیت کے لئے کڑی شرطیں لگائی ہیں تاکہ قوم میں جو صالح عناصر ـــ کمیاب و نادر ـــ موجود ہیں وہ ہر طرف سے کھنچ کھنچ کر اس نظام میں داخل ہوتے چلے جائیں اور بتدریج اخلاقی تربیت حاصل کرکے وہ طاقت پیدا کریں جو ایسے ایک نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے ضروری ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح ہمارے ہاں اسلامی جمہوریت کی روایات پرورش پائیں اور رفتہ رفتہ ایک جماعت روز افزوں تعداد میں پیدا ہوتی جائے جو آگے چل کر اسلامی اصولوں پر ایک نئے انقلابی نظام سیاست کو قائم کرنے اور چلانے کے قابل ہو۔

ایک دوست نے علمی شعبہ کی اسکیم میں صدر کی ہدایت و رہنمائی پر اعتراض کیا ہے۔ انہیں اس میں ذہنی استبداد (Intellectual despotism) اور "ملا شاہیت" کی بو آئی جو حقیقی اجتہاد فکر و رائے اور علمی تحقیق کے لئے سم قاتل ہے۔ لیکن ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ یہاں اس چیز کا تو خیال بھی نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم اس کام کا دروازہ کھول رہے ہیں جو نہایت ضروری ہونے کے ساتھ نہایت نازک بھی ہے، یعنی اجتہاد۔ آج کل لوگوں کو اس کی ضرورت کا تو ایک حد تک احساس ہو گیا ہے مگر اس کی نزاکت کا احساس نہیں ہے۔ وہ اجتہاد کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں، اور ناکافی معلومات، اور اس سے بھی زیادہ ناکافی علمی تربیت

کے ساتھ اس میدان میں دادِ تحقیق دینے لگتے ہیں جس کے مضحکہ انگیز نمونے کمیاب نہیں ہیں۔ ایسے اجتہاد کا دروازہ کھولنے سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ جو شخص اس شعبہ میں داخل ہو وہ خواہ درجۂ اول ہی کا دماغ (First rate mind) کیوں نہ رکھتا ہو، بہرحال اسے محقق و مجتہد بننے سے پہلے ایک طالب علم کی حیثیت اختیار کرنی چاہیے اور وہ ضروری استعداد بہم پہنچانی چاہیے جس کے بغیر آدمی مجتہد نہیں بن سکتا۔ آخر مغرب کی یونیورسٹیوں میں بھی تو ریسرچ اسکالرس کو ابتداءً پروفیسر کی رہنمائی ہی میں کام کرنا پڑتا ہے، اور انہیں میدانِ اجتہاد میں قدم رکھنے کی اجازت اس وقت ملتی ہے جب کافی مدت تک تربیت پانے کے بعد وہ اپنے محقق ہونے کا ثبوت دے دیتے ہیں۔ شاید کوئی علمی حلقہ بھی اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا کہ جب کوئی شخص اپنے متعلق خود سمجھ لے کہ میں محقق ہو گیا ہوں تو بس وہ محقق ہو گیا اور اسے حق حاصل ہو گیا کہ جس فن میں چاہے مجتہدانہ آرا دے۔ پس جب ساری دنیا کے علمی حلقوں میں اس کام کے لیے کچھ شرائط اور اصول ہیں اور وہ قابلِ اعتراض نہیں ہیں تو ہمارے علمی شعبہ ہی نے کیا قصور کیا ہے کہ یہاں اس قسم کی شرائط اور اصول مقرر کرنا ذہنی استبداد قرار پائے؟ ہمیں اسلام کو بازیچۂ اطفال تو بنانا نہیں ہے۔ ہم کس طرح ایک شخص کو پختگی حاصل کرنے سے پہلے اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ اسلام کے احکام کی من مانی تفسیر و تعبیر کرنے لگے۔ البتہ اس شعبہ میں ہدایت اور رہنمائی کے معنی یہ بھی نہیں کہ طالبانِ تحقیق صدر کے غلام اور اس کی رعیت ہوں، اور وہ ان کی آزادیٔ فکر و نظر کو سلب کر کے انہیں اپنا مقلد بنا لے۔ اگر یونیورسٹیوں کے تحقیقی شعبوں میں پروفیسر کی ہدایت اور رہنمائی کے یہ معنی نہیں ہوتے تو یہاں بھی اس سے یہ معنی لینا درست نہیں۔

میرے رفقاء نے مجھے اس ادارہ کا صدر منتخب کیا ہے اور میری اپنی درخواست پر یہ صدارت اس وقت تک کے لیے عارضی رکھی گئی ہے جب تک چالیس ارکان فراہم نہ ہوں۔ میرا یہ خیال نہیں ہے کہ جو شخص کسی ادارہ کی بنا رکھے وہی اس کی صدارت کا حق دار ہے۔ میں اس غلط فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہوں کہ یہ ادارہ جس قابلیت کا صدر چاہتا ہے وہ مجھ میں موجود ہے۔ اور میرے نزدیک جو شخص اس کام کی ذمہ داریوں کو سمجھتا ہو وہ بے وقوف ہوگا اگر اس بار کو خود اپنے سر لینے کے لیے آگے بڑھے۔ یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے کہ اس کی تمنا کی جائے، یہ تو کانٹوں کا بستر ہے۔ جو اس پر لٹایا گیا وہ گویا جیتے جی ہلاک کر دیا گیا اور ہمیشہ کے لیے زندگی کے لطف سے محروم ہو گیا۔ لہٰذا میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آنے والے ۳۵ اشخاص میں ایسے کسی بندے کو بھیج دے جس پر میرے رفقاء کی نظرِ انتخاب ٹھہر جائے، یا جسے میں خود اس کا اہل پا کر بیعت کے لیے ہاتھ بڑھا دوں۔ اگر میری جگہ کوئی عبدِ حبشی بھی اس ادارہ کا صدر ہوگا تو باللہ العظیم اس کی ویسی ہی اطاعت کروں گا جس کا حدیثِ نبوی میں حکم دیا گیا ہے۔